طاقت کا مقابلہ کردار سے

جناب مولانا اسدعلی صاحب قبلہ طاب ثراہ (الہ آباد)

دنیا میں جبروت کا مقابلہ جبروت سے، تشدد کا مقابلہ تشدد سے، طاقت کا مقابلہ طاقت سے ہمیشہ ہوتا رہا لیکن طاقت کا مقابلہ کردار سے، اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت سے پہلے پہل کربلا کے میدان میں کیا گیا جس کو اس کی خصوصیت سمیت تاریخ نہ آج تک دہرا سکی ہے نہ دہرائے جانے کی آئندہ امید ہے۔

امام حسین علیہ السلام کا ایسا ضابط و متحمل انسان جس نے سات برس کی عمر سے ضبط وتحمل کے مثالی کارنامے اپنے باپ کے دیکھے کہ دوسروں نے اقتدار قائم کرلیا لیکن امیرالمومنین نے اسلامی مفاد کی خاطر صبر وضبط سے کام لیا۔ جنگ صفین میں لوگوں کے اختلاف سے جنگ ملتوی کردی۔ اس کے بعد اپنے بھائی کے بے مثال تحمل وبرداشت کا مطالعہ کیا کہ آپ نے امن پسندی اور صلح جوئی کو حق تلفی پر مقدم رکھا۔ وہ حسینؑ جنہوں نے عمر کے اس دور میں جب کہ ولولہ امنگ اور حوصلہ انسان سے خلاف تدبر اقدامات کرادیا کرتا ہے مگر سخت سے سخت ناگوار حالات میں بھی حضورؐ سے کسی ایسے عمل کا مظاہرہ نہیں ہوا جو امن وصلح کے خلاف ہو، نبیؐ وعلیؑ کے اصول کے خلاف ہو، اسلام کے اصول کے خلاف ہو، وہ حسینؑ جس نے خلیفۂ ثالث کا حلق قحط آب کے وقت تر کیا۔ وہ حسینؑ جس نے صفین کے موقع پر امیر شام کی شاطرانہ چالوں کا احساس کرتے ہوئے بلاتوقف معاہدہ پر دستخط کردیا۔ وہ حسینؑ جس نے ۴۰ھ سے ۵۰ھ تک مسلسل زہرگدار حالات کا اپنے ضبط وتحمل سے مقابلہ کیا وہ حسینؑ جس نے معاملات سے کنارہ کش، گوشہ نشین بھائی کو جگر کے ٹکڑوں کی قے کرتے دیکھا، خون دل اگلتے دیکھا، پھر صرف اس آرزو پر کہ نانا کا پہلولحد کے لئے ملے جنازہ پر تیروں کی بارش ہوتے دیکھا جن میں سے چند تیر تابوت کو توڑ کر جسم تک پہنچے۔

وہ حسینؑ جنھوں نے ۵۰ھ سے ۶۰ھ تک اسلام کی عظیم شخصیتوں کو تہہ تیغ ہوتے دیکھا۔ ایسے صلح کل، امن پسند انسان کے لئے سوچنے کی بات ہے کہ کیسے ایک ایسے اقدام کے لئے تیار ہوگیا جس میں اس کے تمام ساتھیوں کے تہہ تیغ ہوجانے کا یقین ہو۔

یقینا کوئی ایسا ہی مقصد ہوگا جس کا نظرانداز کرنا ممکن ہوگا نہ اس اقدام کے سوا اس کے تحفظ کی دوسری صورت ہوگی۔ امام کا مقصد کوئی نیا نہ تھا۔ وہ تو وہی تھا جسے تمام انبیاؑء لے کر آئے تھے اور جس کے لئے تمام مصلحین ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ آپ کا مقصد دنیا کو اس حقیقت سے روشناس کرانا تھا کہ حکومت وشہنشاہیت اور ہے اور اسلامی تمدن وتہذیب اور اس کے اصول اور ہیں۔ ان دونوں طریقوں کے درمیان ان دونوں انسانی نظاموں کے درمیان ایک ایسی خلیج جو کبھی پاٹی نہ جاسکے اس لئے قائم کرنی ضروری تھی کہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اس طرح ایک کیا گیا تھا کہ سطحی نظر رکھنے والے لوگ امتیاز نہیں پیدا کرسکتے تھے کہ انسانوں کے لئے الٰہی نظام کیا ہے؟ اور انسانوں کا خودساختہ نظام کیا ہے؟ دوسرے لفظوں میں اسلام کا نظام کیا ہے؟ اور بخیال خود مسلمانوں کا نظام کیا؟ حضور دیکھ رہے تھے کہ میرے نانا کے وہ تعلیمات جن کو قربانیاں پیش کرکے رائج کیا گیا تھا، بالکل فراموش ہوگئے ہیں اور شہنشاہی اقتدار کے کروفر نے نگاہوں کو

اس طرح ہٹادیا کہ اب ان تعلیمات کی چمک دنیا کو نظر نہیں آتی۔

آپ دیکھ رہے تھے کہ وہ نظام زندگی جس کو خدا کی طرف سے اسلام کے رسولؐ نے پیش کیا تھا، غرض پرستوں کے بنائے ہوئے نظام کی گھٹا میں اس طرح چھپ گیا ہے کہ آئندہ نسلوں کو قیامت تک یہ پتہ نہ چلے گا کہ درحقیقت وہ آئین کیا تھا جسے پیغمبر اسلامؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ کہی ہوئی بات ہے کہ آنے والی نسلوں کے لئے گذشتہ حالات جاننے کا ذریعہ اگر کوئی چیز ہے تو تاریخ ہے اب اگر کوئی طالب تحقیق تاریخ کی دوربین سے اسلامی نظام تمدن کی جانچ کرنا چاہتا تو اس کو اسلام کی سرزمین پر دمشق اور بغداد کے اونچے قصر نظر آتے، وہ بڑے بڑے پھاٹک دکھائی دیتے جن پر زرتار پردے پڑے ہوئے ہیں، وہ اونچی دیواریں دکھائی دیتیں جو جواہرات سے مرصع ہیں، سونے چاندی سے منقش ہیں، جواہر نگار تخت نظر آتے، زریں کمر غلام صف بستہ دکھائی دیتے، لطفِ خرام ساقی اور ذوقِ صدائے چنگ نظر رہا اور سامعہ نواز ثابت ہوتا، یا اسکو بنی ہاشم کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر نظر آتے جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان کچھ بچے خدا کی یاد میں مصروف ہیں، جہاں غریب، محتاج، مسکین آتے ہیں تو اپنے سامنے کا کھانا اٹھا کر دے دیا جاتا ہے اور خود پانی پی کر بسر کر لی جاتی ہے، جہاں غلام اور کنیز سے مساویانہ برتاؤ کیا جاتا ہے جیسا بھائی بھائی کے ساتھ کرتا ہے۔

وہ اسلامی تہذیب وتمدن کی جانچ کرنے والا سمجھتا کہ اسلام کے پیغمبرؐ نے بھی عربوں کی ایک بڑی حکومت اور شہنشاہیت قائم کردی۔ عربوں کو دوسری قوموں پر مسلط کردیا جس سے امیری غریبی، قوت ومسکنت، اقتدار وبے بسی، نسل ورنگ کے وہی حدود وامتیازات برقرار ہیں جو پہلے تھے، تو اس کے لئے ایک ایسے صاحب آیات، معجزات وبینات والے منتخب بندے کی کیا ضرورت تھی جو عمل کے لحاظ سے صاحب خلق عظیم تھا اور نظام زندگی کے لحاظ سے رحمۃ للعالمین تھا۔ اگر بلاد اسلامیہ کا موجودہ نظام اسی کا مرتب کردہ ہے تو پھر اس کو تمام عالم کے لئے رحمت کہنا مبالغہ ہے، وہ صرف چند قصر کے رہنے والوں کے لئے رحمت ہوگا، اکثریت کے لئے اس کا آئین سازگار نہیں۔

حسینؑ نے بھولی ہوئی دنیا کو رسول کی تعلیم اور ان کا قائم کردہ نظام اس طرح یاد کرانے کا بیڑا اٹھایا کہ پھر دوسرے کارنامہ کی ضرورت باقی نہ رہے، حسینؑ ہی کا ذکر رسولؐ کے مقصد کی یاد دلانے کے لئے کافی ہو اور حسینؑ ہی کی ذات پورے طور سے رسول کو پہچنوا دے۔ اسی لئے رسولؐ نے کہا تھا، "حسین منی وانا منہ"۔ بس حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کی نگاہ کو ان اونچے مناظر سے ہٹا دیں، ان بلند قصروں، سر بفلک ایوانوں سے موڑ دیں اور اسلامی اصول کو عملی حیثیت سے اتنا روشن کر کے پیش کریں کہ نظر متجسس اٹھتے ہی اسی پر جا پڑے اور اسی کی چمک دمک میں محو ہوجائے جہاں ان قصروں کی بلندی سرنگوں ہوجائے، اور میناروں کی روشنی ماند پڑ جائے، بس حسینیت کا کردار خط نصف النہار پر نظر آئے، دنیا دیکھ لے کہ اسلام کا آئین اور ہے اور فرمارورایان اسلام کا آئین اور۔ فرمانرواؤں کے طریق عمل اسلام کے اصول سے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا، نہ ان طریقوں کو دیکھ کر اسلام پر اعتراض کرنا۔

جب یہ مقصد تھا امام کا، تو پھر اس کے تحفظ کے لئے نہ بیعت ممکن تھی، نہ صلح، نہ جنگ۔ بیعت کے متعلق یہ کافی ہے کہ امام کو اس اقدام کے سلسلے میں مختلف اوقات میں بہت سے مشورے دیئے گئے۔ یہ کہا گیا کہ طائف چلے جایئے۔ یہ کہا گیا کہ یمن چلے جایئے، یہ کہا گیا کہ کوہ اجا میں ۲۰ ہزار مددگار ہیں وہاں چل کر پناہ لیجئے مگر یہ کسی عزیز یا دوست نے مشورہ نہیں دیا کہ حضور یزید کی بیعت کر لیجئے کیونکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ امام یزید کی بیعت نہیں کر سکتے تو جب ان لوگوں کا یہ خیال تھا تو پھر حسینؑ کا بیعت کے محال ہونے کے متعلق کیا خیال ہوگا، اس کا اندازہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔

اس وقت امام کی بیعت کے معنی تھے اس روحانی مرکز کی شکست جس کے حسینؑ ذمہ دار تھے۔ اس کے معنی اس تمدن اور

نظام کے قبول کر لینے کے تھے جس کے رائج کرنے والے سلاطین دمشق تھے اوراس کے معنی یہ تھے کہ رسولؐ اسلام نے جن اصول کو رائج کرنے کے لئے قربانیاں دی تھیں فرزند رسولؐ اس کے متضاد اصول کو رواج دیتا۔

پھر سابق کے خلفاء اپنے کو کتاب وسنت کا محافظ ظاہر کرتے تھے اور کتاب وسنت پر بیعت لیتے تھے، زبان سے کتاب وسنت پر عمل کرنے کو کہتے تھے،لیکن یزید کے دور میں تو کتاب وسنت کے نام پر سر قلم ہوتے تھے۔ یہاں اس بات پر بیعت لی جاتی تھی کہ ہم خلیفہ کی ملکیت ہیں، غلام بنائے یا آزاد کردے۔ اگر امام بیعت کر لیتے تو لوگ فاسق وکافر کی بیعت کو جائز سمجھ لیتے اور منصب خلافت کے لئے ایسے کو بھی اہل سمجھ لیتے۔ اگر حسینؑ بیعت کر لیتے تو گویا امام حسن نے یزید کی بیعت کر لی بلکہ علیؑ نے اور رسولؐ نے بیعت کر لی بلکہ تمام انبیاءؑ نے۔ اگر آپ بیعت کر لیتے تو عام مسلمانوں پر قول وفعل یزید حجت ہوجاتا یعنی واجب العمل ہوجاتا تو پھر محرماتِ رسولؐ فرزند رسولؐ کے ہاتھوں واجبات بن جاتے۔ اگر بیعت کر لیتے تو حدیث رسولؐ غلط ثابت ہوتی: "مثل اهلبيتى كمثل سفينة نوح من ركبها نجى ومن تخلف عنها غرق وهوىٰ"۔ اگر بیعت کر لیتے تو آیت تطہیر کی تکذیب ہوتی کہ خدا ان کو پاک بتائے اور وہ ایسے پلید کی بیعت کریں۔

اگر حضور بیعت کر لیتے تو جن لوگوں نے اب تک اس کو مکروہ سمجھا تھا، آپ سے بہتر ہوتے اوران کے لئے اس صورت میں کوئی جائے پناہ باقی نہ رہتی، اسی لئے آپ کے لئے عالم کے کسی گوشہ میں چلا جانا بھی مناسب نہ تھا۔ امام جانتے تھے کہ بیعت کا قصہ برائے نام ہے، وہ خواہ بیعت کریں یا نہ کریں، یزیدان کو زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دے گا۔ جب باپ نے امام حسنؑ کو باوجود صلح، خاموشی اور گوشہ نشینی کے زہر دلوادیا تو بیٹا کب امام حسینؑ کو زندہ رہنے دیتا۔ لہٰذا مادی لحاظ سے بھی بیعت بے سود تھی۔ ہاں، نقصان البتہ یہ تھا کہ نانا کے عظیم الشان کارنامے بھی قتل ہوجاتے اور بیعت نہ کرنے سے چند جانیں تو ضرور جائیں گی لیکن امت زندہ ہوجائے گی، اصول کا دائمی تحفظ ہوجائے گا۔

جب بیعت ناممکن ہوئی تو صلح بھی ناممکن ہوئی کیونکہ حکم تھا کہ یا بیعت یا قتل۔ پھر صلح کی منزل کو امام حسنؑ طے کر چکے تھے اور شرائط صلح کی مخالفت ہی کا وہ نتیجہ تھا جو امام حسینؑ کے سامنے درپیش تھا۔ منجملہ شرائط کے یہ تھا کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی کے مقرر کرنے کا حق نہیں ہے، جس کی اس نے خلاف ورزی کی اور یزید کے لئے بیعت لی۔ تو جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام رہی، تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنیٰ۔

دوسرے یہ کہ امام حسنؑ کی صلح کا مقصد یہ تھا کہ روحانیت کا مرکز دنیوی اقتدار کے مرکز سے علیحدہ ہوگیا۔ جس سے مقصد کا تحفظ ہوگیا یعنی یہ بتانا کہ حکومت وشہنشاہیت اور ہے اور اسلام کے اصول اور ہیں اور مقصد کے تحفظ کی دلیل یہ ہے کہ حضرت کی زندگی محفوظ نہیں رہی کیونکہ حریف کا مقصد پورا نہیں ہوا، کھٹک باقی رہی لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر ہم تشدد سے کام لیں گے تو اس شکست کی انتہائی تکمیل ہوگی۔

یزید بھی اگر اس بے تعلقی اور علیحدگی کو شکست کے مرادف نہ سمجھتا تو اسی پر اکتفا کرتا، حضرت سے معترض نہ ہونا اور جیسے حضرت کی طرف سے عدم تعرض قائم تھا، ویسے ہی وہ بھی عدم تعرض اپنی طرف سے برقرار رکھتا، لیکن تدبر کی کمی اور شکست کے احساس نے اس کو شکست کے کمال کی منزل پر پہنچادیا جس سے جہاندیدہ باپ نے اس کو منع کیا تھا۔

تیسری صورت جنگ یعنی طاقت کا مقابلہ طاقت سے، یہ بھی ناممکن تھا کیونکہ طاقت کے مقابلے میں آل رسولؐ کے ساتھی ہمیشہ کم نکلتے تھے، سابق کے تجربات جس کے شاہد تھے۔ تو اب طویل مدت گذرنے کے بعد کیونکر امکان ہوسکتا ہے کہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جائے جب کہ وہ جتھا پراگندہ ہوچکا، ہزاروں آدمیوں کے ضمیر خریدے جاچکے، ارباب استقلال

وثبات کے سر قلم کئے جا چکے، ہزاروں کو جیلوں میں بھرا جا چکا، بقیہ لوگ، دہشت زدہ ہوکر منتشر ہو چکے۔ ایسی صورت میں جنگ کا کون سا موقع تھا۔

پھر اس سے امام کا مقصد حاصل نہ ہوتا، نہ اس صورت میں جب کہ آپ کو شکست ہوئی، نہ اس صورت میں آپ کامیاب ہوتے کیونکہ اکثریت یہی سمجھتی کہ یہ دو بادشاہوں کی جنگ تھی، حکومت وسلطنت کی غرض سے۔ اگر حضرت فتح بھی حاصل کرتے، تو اصل مقصد کو فائدہ نہ پہنچتا۔ اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی حیثیت سے ہوتا جس کا اثر دیر پا نہ رہتا اور بنی امیہ کے چہرے پر اسلام کی نقاب بدستور پڑی رہتی اور اگر کچھ لوگ امام کو حق پر بھی سمجھتے تو حریف کو سابقین کی طرح خطائے اجتہادی کے ماتحت لاکر معذور سمجھ لیتے۔ یہی وجہ تھی کہ حضور نے نہ تو مکہ ومدینہ میں ساتھی جمع کئے، نہ طرماح بن عدی کے کوہ اجا کے بیس ہزار سواروں کی مدد حاصل کی کیونکہ آپ کے مقصد کی تکمیل کے لئے یہ چیزیں نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر تھیں، کیونکہ حریف کو مادی شکست دینا آپ کا مقصد نہ تھا۔ حضور کا مقصد حریف کے کردار کو شکست دینا تھا اور اس کے کردار کی شکستگی کا اعلان کرنا تھا۔ جب یہ مقصد تھا تو اسی کے لحاظ سے فتح وشکست کا معیار بھی قائم ہوگا۔ جس کا کردار غالب رہا، وہ فاتح، اور جس کا کردار پست رہا وہ مغلوب ومفتوح۔ اب یہاں انسانی صورتوں کے جماؤ کی ضرورت نہیں، بلند کردار کے انبار لگا دینے کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حسینؑ نے بار بار مجمع کو چھانٹ کر صاف کر دیا تاکہ کوئی ایک بھی ایسا نہ رہ جائے جس کا کوئی ایک اقدام بھی کردار کی بلندی کے شایان نہ ہو، کوئی ایک بھی ایسا نہ ہو جس کے اقدام سے آپ کی طرف جارحانہ اقدام کا الزام عائد کیا جا سکے نگاہیں بہترؓ ہوں لیکن نقطۂ نگاہ ایک ہو، جسم بہتر ہوں مگر روح عمل ایک ہو، دل بہتر ہوں لیکن مرکز فکر ونظر ایک ہو، قدم بہتر ہوں لیکن اقدام ایک ہو، نسل ورنگ کے امتیازات ہوں لیکن مقصد کے لحاظ سے سب حسینی ہوں، سن وسال کے لحاظ سے مختلف ہوں لیکن حوصلہ کے لحاظ سے سب جواں ہوں، عملی حیثیت سے دنیاوی زندگی کو حقیر ثابت کرنے کے لئے سب تیار ہوں، بڈھے ایسے ہوں جن کی آنکھوں سے شیر نر کا جلال نمایاں ہو، جوان ایسے ہوں جو موت کے لئے شہد سے زیادہ شیریں ہونے کا اعلان کررہے ہوں، لڑکے ایسے ہوں جو حق پر مٹنے کو لازوال زندگی سمجھتے ہوں، بچے ایسے ہوں جو تیر کھا کر مسکرا دیتے ہوں، بیمار ایسے ہوں جو طوق ورسن کو آزادی کا زیور سمجھتے ہوں، بیبیاں وہ ہوں جو شہیدوں کے خاموش ہوتے ہی حسینی مقصد کی تبلیغ شروع کر دیں، جن کو مقصد شہادت بیاں کرنے کے لئے نہ بھوک پیاس روک سکے، نہ بے کسی وبے بسی مانع ہو، نہ دربدری پریشان کر سکے، نہ بے پردگی خوفزدہ بنائے، نہ قید وبند ذہن پر قفل ڈال سکے، نہ درباروں کا جاہ وحشم زبان میں گرہ لگا سکے۔ بس کردار کا یہی وہ سیلاب تھا جو یزید ویزیدیت کو پرِ مگس کی طرح بہا لے گیا اور جس طریقہ جنگ کو دنیا نے اس کے پہلے مشاہدہ نہیں کیا تھا عالم کو دکھلا گیا۔

✿✿✿

بقیہ۔۔۔۔۔۔۔حیات شہداء

پر آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو بھی ان کی یاد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کی شہادت کو تقریباً ۱۴ ر سو سال گذر گئے ہیں لیکن جب محرم کا چاند فلک پر نمودار ہوا حسینؑ کی ذہنی تصویریں دماغوں میں جگمگانے لگیں۔ یہ کیا ہے اگر حیات نہیں؟ کیونکہ اگر کوئی انسان زندہ رہتا ہے تو اس کے آثار حیات اسی کے ساتھ ہوتے ہیں مگر جب کوئی شخص دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو وہ آثار نظر نہیں آتے۔ حسینؑ کی زندگی کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے اصول زندہ ہیں، ان کا نام زندہ ہے، ان کی بات زندہ ہے اور یہ سب کچھ ہمیشہ باقی رہے گا کیونکہ اسی کو حیات جاوید کہتے ہیں۔

✿✿✿